اُردُو زبان میں سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حصہ ہفتم

علّامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

علّامہ سیّد سُلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الفیصل

ناشران و تاجرانِ کُتب

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

فہرست مضامین

پیش لفظ	۵
اظہار عجز	۱۰
مقدمہ	۱۱
معاملات	
ساتویں جلد کا موضوع	۱۱
معاملات کی حدود	۱۱
معاملات سے ہماری مراد	۱۲
اس کام کا اشکال	۱۳
دیگر مذاہب اور معاملات	۱۳
معاملات کے ماخذ	۱۴
قانون سازوں کی بیچارگی	۱۴
جمہوریت کی ناکامی	۱۴
صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری	۱۵
قانون الٰہی کی ضرورت	۱۵
کتاب اور میزان	۱۵
قانون الٰہی کی دائمی یکسانی	۱۷
فطری حقوق و معاملات کی یکسانی	۱۸
قانون کا بنیادی تخیل	۱۸
قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت	۱۸
ایک اصولی فرق	۱۹
اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت	۲۰
عہد نبوی میں نظام حکومت	۴۳
سلطنت اور دین کا تعلق	۷۵
لفظ رعیت	۸۲
سلطنت اور ملکیت کی حقیقت	۸۶
اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے	۸۶
لفظ ملک الملوک کی ممانعت	۸۷
امت مسلمہ کی بعثت	۹۶
قوت عاملہ یا قوت آمرہ	۱۰۸
حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے	۱۱۲

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْمُرْسَلِیْنَ وَ خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِه وَ صَحْبِه اَجْمَعِیْنَ.

سیرت النبی اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گراں مایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح وتوصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر وعقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی ودیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

مادحِ خورشید مدحِ خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرتِ طیبہ، حالات وواقعات اور شمائل وعادات سے آگے بڑھا کر پیغامِ محمدی، تعلیماتِ نبوی اور شریعتِ اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے۔ انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل ومعجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثتِ محمدی اور سیرتِ نبوی کی وسعت وجامعیت اس کی بے خطار ہبری ورہنمائی اور ہر عہد میں حیاتِ انسانی ونسلِ آدم کے لیے ہدایت وسعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا۔ کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد وہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات وسیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت وتعلیماتِ نبوی پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے، کہ ان کی کتابِ زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلۂ سیرت النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات، وسعت نظر، جامعیت، اعتدال وتوازن، احتیاط وتورع، شریعتِ اسلامی کی روح ومزاج سے آشنائی، قدیم وجدید کی واقفیت، دین کے اولین ومستندترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی وفکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعتِ اسلامی اور تعلیماتِ نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط وتفریط سے پاک، تجدد وآزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود وتنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصرِ حاضر کے ذہن اور حالات ومسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات میں مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے، اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گزشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیشِ نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیاتِ مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطباتِ مدراس اور سیرت النبی کی جلد سوم، چہارم، پنجم وششم کا زور اور آبشارِ علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغِ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل وغیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا لیکن ایک مبصر وماہرِ فن اور ایک استاد وکہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصلِ مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبی کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کی تحریرات وتحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق مضامین ومباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کے قارئین وعشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب ونظر کو روشن کرتے۔ خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا، اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر ونظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور

تحریکوں کے قائد افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے' اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا' اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا' اس لیے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا' مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے' اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے' اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علما کی کتابیں نصًا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔''(۱)

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

''اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا' لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا' اور پھر رک جانا پڑا' ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزمِ درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔''(۲)

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں ''معاملات'' کی تعریف' اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔ میزان کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے' سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدتِ مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکزِ ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح وتربیت کے لیے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا' ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیّزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے' وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) سیرۃ النبی جلد ۷' مقدمہ ص ۱۳۔

(۲) ایضاً ص ۱۴۔

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب ونبوت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔''(۱)

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیاتِ بینات جمع کر دیتے ہیں، اور یہ سیرتِ نبوی کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے، لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد وایمان، شرائع واحکام اور حقوق وفرائض اس کے لیے بمنزلۂ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق وفرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجۂ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے۔''(۲)

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عملِ صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دینِ مقبول کی پائیداری واستواری اور اس امن وامان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہوسکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہبِ سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریقِ دین وسیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال نے صحیح کہا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سر بلندی ہے یہ سربزیری

اس لیے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

''اسلام دین ودنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق

(۱) ص ۲۳۔
(۲) ص ۴۳۔

ہے جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ' اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے' وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرمان روا ہے۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (الزخرف:۷)

''اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔''(۱)

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے' نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں' اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

''اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے' نہ غنیمت کی فراوانی' نہ دولت کی ارزانی' نہ تجارت کا فروغ' نہ جاہ و منصب کا فریب' نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے' بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔''(۲)

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے' اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے' لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ''نقشِ سلیمانی'' ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگارِ نبوی' متکلمِ اسلام اور نابغۂ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی کی کسی جلد پر یہ ہیچ مدان پیش لفظ لکھے' لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے' اس لیے اس پر ایک ''ناقص'' کا کچھ لکھنا محل تعجب نہیں کہ

دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء

۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

---

(۱) ص: ۳۴-۳۵

(۲) ص: ۴۳

اظہارِ عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!
کہ محرم نیست خسرو راز بان در گفت گوے تو

دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ جولائی ۱۹۸۰ء

ہیچ مدان مور سلیمان
سید صباح الدین عبد الرحمان۔

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْمُرْسَلِیْنَ وَ عَلٰی اٰلِہ وَ اَصْحَابِہِ الطّٰاھِرِیْنَ.

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی حدود

معاملات کا اطلاق فقہا نے حقوقِ عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقہا شافعیہ نے احکامِ شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے' یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امورِ دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں' اگر ان احکامِ شرعیہ سے جو امورِ دین کے متعلق ہیں' اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے' [1] (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین و دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی' یہ قسمیں کی ہیں۔

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات' مشروبات' ملبوسات اور مسکونات کے احکام اور تیسری چیز معاملات ہے جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص و حدود و تعزیرات)

فقہائے احناف میں سے علامہ نجیم نے بحر الرائق کے شروع میں امورِ دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے' اعتقادات' عبادات' معاملات' مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر

(۱) کشاف' اصطلاحات الفنون احمد تھانوی' مطبوعہ کلکتہ ج ۱ ص ۲۳ بحوالہ توضیح و تلویح۔

منقسم ہے' معاوضات مالیہ (بیع وفروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر' یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں' قتل نفس پر زجر' کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر' کسی کی آبروریزی پر زجر' کسی کی پردہ دری پر زجر' قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

معاملات سے ہماری مراد

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے' یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوقِ عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے' خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہا نے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے' جیسے کتاب السیر امام محمدؒ اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں' اور متاخرین نے ان کو احکامِ سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے' جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ وخراج وزکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں' اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کرکے ان کا نام کتاب الاموال' یا کتاب الخراج رکھا ہے' جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ۔ اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصولِ عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتبِ عقائد کے خاتمہ میں ذکر کردیے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریقِ انتخاب' اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرزِ بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لیے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی وبیشی اور مباحث میں ردوبدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت' مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیریوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زائد افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو۔

ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسبِ ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں معاشریات' اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے' معاشرت میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی' اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال

یہ احکام قرآنِ پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں' محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں' اور فقہا نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے' ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نصًا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے' مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی ذاتِ مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا' چنانچہ کام کا آغاز گو ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے' دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا' ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزمِ درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ﴾

دیگر مذاہب اور معاملات

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں' تورات میں گو مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے' ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں

قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علمِ الٰہی اور علمِ مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحیِ الٰہی کے بجائے عقلِ انسانی پر رکھی ہے، اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلانِ طبع قانون کا معیار ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانینِ جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے۔ اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی، قوم اور غیر قوم، امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار، طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرضِ بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے، وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری

عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح وعادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا اس لیے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع، غرور وتکبر، ہوا وہوس، رشوت اور انتفاع ناجائز وخوف وہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلافِ انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانونِ الٰہی کی ضرورت

اسی سبب سے مصلحتِ الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دستِ الٰہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے، جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانونِ طبع کہتے ہیں جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ﴾ (شوریٰ:۱۷)

''وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔''

﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ الْمِیْزَانَ﴾ (حدید:۲۵)

''اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔''

کتاب اور میزان

میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظامِ کائنات تل رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں نصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ○ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدَانِ ○ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ○ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ○ وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ○﴾ (رحمٰن:۱-۹)

''رحمت والا خدا جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے

ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیرِ فرمان ہیں' اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تا کہ تول میں کمی وبیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں' اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل' انصاف اور ظلم' صحیح اور غلط ہے اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب' ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد وارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر جس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہی ہیں' اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامِ عدل کی پیروی اختیار کرے قرآن پاک میں بار بار ہے:

﴿وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ﴾ (انعام:۱۵۲)

''اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔''

﴿فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ (اعراف:۸۵)

''تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔''

﴿اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ (ہود:۸۵)

''ناپ اور تول کو پورا کرو۔''

﴿وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ (ہود:۸۴)

''ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔''

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید وفروخت کی اشیا بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں' لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجیے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں' [1] ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے' وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے' اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○﴾ (المطففین:۱-۳)

''پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔''

---

(۱) تفسیر طبری میں آیات میزان سورۂ حدید اور سورۂ رحمان وغیرہ میں دیکھیے۔

معاملاتِ انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے' چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیامِ عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (حدید:۲۵)

''اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے لیے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو' تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔''

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں' ایک کتاب یعنی احکامِ الٰہی کا مجموعہ' دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے' یعنی جو احکامِ الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے' یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانونِ الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانونِ الٰہی کی دائمی یکسانی

قانونِ الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے اس لیے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے' مگر یہ خیال سراسر فریب ہے کیونکہ شے نہیں بدلتی' اس کے رنگ شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصولِ طبعی کبھی نہیں بدلتے ﴿اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾ گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی' آگ برف نہیں بنتی' برف آگ نہیں' روشنی تاریکی نہیں' تاریکی روشنی نہیں' زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے' رات اور دن پے در پے آتے جاتے رہتے ہیں' گھنٹے گھڑی' پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں۔ سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں' ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں' جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمران تھا' آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی' نہ چودھویں' پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

﴿وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (فتح:۲۳)

''خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔''

فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر اخلاقی ومعاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا' نیکی بدی نہیں بنتی' بدی نیکی نہیں' سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا' جھوٹ سچ نہیں' ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں' دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا' دوسروں کی چیز ناحق لینا' چوری کرنا' ڈاکا ڈالنا' دوسروں کی عزت وآبرو کو داغ لگانا' دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا۔ حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا' کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا۔ لین دین میں طرفین کی رضامندی' لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام' اخلاق سوز حرکات کی بندش' فتنہ وفساد کا انسداد' ظالمانہ طریقوں کی ممانعت' ہر عہد میں' ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے۔ جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزا برقرار رہیں گے' البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل

ہر مجموعۂ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت' کہیں وطنی افادیت' کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لیے اس مجموعۂ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں۔ جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے وہاں کالے' گورے یورپین اور نیٹو کے اصول کی کارفرمائی' ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی اقطاعِ ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی' یونانی اور غیر یونانی' مصری وغیر مصری' ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں' بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے' بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے' فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لیے زمین سے فتنہ وفساد کا دفع' اس کے بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن واطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور

خدع وفریب کی روک تھام ہے'[1] چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنی حدود وتعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ وفساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات ومعاشرت کے اصول اور مسائل ہیں' ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن واطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں' ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔

اس اویر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف' زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے' یہ قانون خدا کا ہے' خدا کے سارے بندوں کے لیے بنایا گیا ہے' وہ چاہے کالے ہوں یا گورے' آریائی ہوں یا سامی' یورپی ہوں یا ایشیائی' ہندی ہوں یا حجازی' عجمی ہوں یا تاتاری' سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں' اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں' ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں' یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ خدائے واحد وبرحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں' مسلمان ہیں' دوسرے وہ جو گو اس خاص قانونِ الٰہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسی ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو' مانتے ہیں' ان کا نام ذمی ہے' لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانونِ الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے' یہ کتابی ہیں اور دوئم وہ جو اپنے قانونِ الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں' یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں' اسلامی قانون میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں' جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں' تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کے برقرار اور امورِ معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے' جو ہر چیز کو احکامِ شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

(۱) اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت' حقیقت' اس کے شرائط واوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

(۲) معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار ومصالح۔

---

(۱) علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام' اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابوابِ معاملات ملاحظہ ہوں۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے' آپؐ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی' بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی' تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جاسکے اور اس کے لیے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا﴾ (نور:۵۵)

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے' یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا' جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے' جما دے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا' میری بندگی کریں گے میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔''

اور اس کے لیے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (انفال:۳۹)

''اور ان سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔''

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (بقرہ:۲۵)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے' لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے علم وعبادت' تندرستی' روزی' مال ودولت' فتح ونصرت' اولادِ صالح' مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے۔ دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے' ایک اور جگہ فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (نحل:

۳۰)

''اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے' اور آخرت کی بھی لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۸)

''تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔''

دنیا کا ثواب فتح و نصرت' ناموری و عزت' مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی' خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ (نحل:۴۱)

''اور جنہوں نے گھر چھوڑا خدا کے لیے ستائے جانے کے بعد' ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔''

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

﴿وَ اكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ﴾ (اعراف:۵۶)

''اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔''

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے' مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی' اچھی اور پائیدار ہے اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں' بلکہ ضمنی ہو' یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○﴾ (ہود:۱۵-۱۶)

''جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں اور کمی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔''

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (شوریٰ:۲۰)

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔''

﴿مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۵)

''جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔''

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا○ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوْرًا○﴾ (بنی اسرائیل:۱۸۔۱۹)

''جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر دھکیلا جا کر اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔''

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (نساء:۱۳۴)

''تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو کہ) اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔''

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنَاهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا﴾ (نساء:۵۴)

''تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ (مائدہ:۲۰)

''اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے۔ حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں پوری ہوئی' طالوت کی نسبت خبر دی گئی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ (بقرہ:۲۴۷)

''بے شبہ خدا نے طالوت کو تمھارا بادشاہ مقرر کیا۔''

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (بقرہ:۲۴۷)

''اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ (صٓ:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی۔

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ﴾ (صٓ:۳۵)

''اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔''

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی' اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

﴿اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (آل عمران:۲۶)

''اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔''

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے۔

﴿اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۱۰۵۔۱۰۶)

''بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں خدا کے فرمان بردار لوگوں کے لیے پیام ہے۔''

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتادیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے' فرمایا:

﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○﴾

(حج:۴۰۔۴۱)

''اور البتہ خدا اسی کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں' زکوٰۃ دیں' اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا' وہ پہلے خود اچھا ہوگا' اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دینِ حق کی مدد کی جائے جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں خدا ن کی مدد فرماتا ہے' ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ونی چاہیے' چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا:

﴿وَ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (نور:۲)

''اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے' اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔''

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (بقرہ:۲۷۹)

''تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ۔''

اس لیے نجران کے عیسائیوں سے آپؐ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا' اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ (۱) جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں' ڈاکا ڈالیں' لوٹ مار کریں' قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل' پھانسی' قطعِ ید اور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

---

(۱) ابوداؤد' باب اخذ الجزیہ۔

﴿ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (مائدہ:۳۳)

''یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی۔

﴿اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (اعراف:۱۲۸)

''خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔''

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی' الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَ یَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ (اعراف:۱۲۹)

''قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے' اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

آخر جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافتِ الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی۔

﴿وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَھَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (اعراف:۱۳۷)

''اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھّم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔''

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہِ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے تو دفعتاً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا' اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:

﴿وَ قَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ○ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَ کَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّۃَ عَلَیْھِمْ وَ اَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ جَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ○ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْھَکُمْ وَ لِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ کَمَا دَخَلُوْہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ لِیُتَبِّرُوْا مَا

عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۴۔۷)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا' تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا' اور تم کو مال اور اولاد سے مدد دی' اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لیے' اور برا کرو گے تو اپنا' پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں' اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔''

اہلِ خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکامِ الٰہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دو دفعہ ان کی شامتِ اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا' ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں' اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں میں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا' ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے' دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۸۔۹)

''امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا' اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے' تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے' یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے' اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔''

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی ﷺ پر ایمان لائیں' لیکن وہ جب اس سے محروم

رہے تو رحمتِ الٰہی بھی دور ہوگئی۔ کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

﴿اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (بقرہ:۴۰)

''تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔''

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاقِ الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسَاكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (بقرہ:۸۳۔۸۵)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا' اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور اپنوں کو ان کے وطن سے نہ نکالنا' تو تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو' پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔ اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا۔ یہ کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔''

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ (بقرہ:۸۵)

''تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں۔''

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰی فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

عَظِیْمٌ﴾ (بقرہ:۱۱۴)

''اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا ذکر کئے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو' ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں' مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں ان کے لیے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے' ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے' ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں' ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے۔

﴿ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (مائدہ:۳۳)

''یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے' اور آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔''

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنا لیا تھا یہ سزا سنا دی گئی:

﴿لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (مائدہ:۴۱)

''دنیا میں بھی ذلت ہے' اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔''

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں' ان کے لیے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا ھُدًی وَّ لَا کِتَابٍ مُّنِیْرٍ ○ ثَانِیَ عِطْفِہٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَہٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ نُذِیْقُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ ○﴾ (حج: ۸۔۹)

''اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے گمراہ کر دے' اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتشِ سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔''

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحیِ الٰہی نے خبردار کر دیا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ ذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ﴾ (اعراف:۱۵۲)

''(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور دنیا کی

زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

یہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت' قومی مسکنت' اور غضبِ الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے کیونکہ انہوں نے احکامِ الٰہی سے انحراف کیا' خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدودِ الٰہی کو توڑتے رہے:

﴿وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُ وْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (بقرہ:٦١)

"اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی' اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے' یہ اس لیے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔"

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لیے مہلت کا آخری موقع تھا' لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی۔ اس پر خدا نے قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُ وْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (ال عمران:۱۱۲)

"یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت (دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں' اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لیے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس لیے کہ) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے' یہ اس لیے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔"

دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (اعراف:۱۶۷)

"اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا' مہربان بھی ہے۔"

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآنِ پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے' تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کیے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب' ذلت' نکبت اور مسکنت کی تفسیر ''جزیہ'' سے یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے قرآن پاک کی دعا میں ہے:

﴿اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ﴾ (آل عمران:۲۶)

''اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔''

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے' یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں' بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے' احکامِ الٰہی سے انحراف' انبیاء و مصلحینِ امت کا قتل و تکذیب' حرص و طمع' سود خوری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں' وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ ذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ﴾ (اعراف:۱۵۲)

''(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا تھا' ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا' اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچے کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لیے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہ سائی کرے گا اور ارض وسما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش وطلب میں دربدر پھرے گا' مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

﴿وَ مَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ﴾ (حج:۱۸)

''اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔''

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے' اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان' اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام

عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ○ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ (مائدہ:۶۵۔۶۶)

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔''

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا' تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (اعراف:۹۶)

''اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیز گار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے' مگر انہوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔''

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (نور:۵۵)

''جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ (فتح:۲۰)

''خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔''

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیے ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ

رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ یُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ○ وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ○﴾ (الصّف:۱۰۔۱۳)

''مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے' وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشتہائے جاودانی میں (تیار ہیں) داخل کرے گا' یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہو گی اور فتح عنقریب ہو گی اور مومنوں کو اس کی خوش خبری سنا دو۔''

یہ فتح و نصرت اس دنیا میں ملنے والی تھی جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظّمہ کی فتح تھی' اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (توبہ:۳۳)

''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا' تا کہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔''

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح و سورۂ صف میں دہرائی گئی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے' یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے' بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبرِ صادق کی طرف سے دی جا چکی تھی' تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (انفال:۳۹)

''اور لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔''

سارا حکم خدا کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرمان برداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے' جس کی بھی اطاعت ہو وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح ونصرت اور حصولِ غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ○ وَّ مَغَانِمَ کَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا○ وَعَدَکُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ کَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَکُمْ هٰذِهٖ .....وَ اُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا○﴾ (فتح: ۱۸۔۲۱)

''(اے پیغمبر)! جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا' اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی' بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں' اور خدا غالب' حکمت والا ہے۔ خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے' تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی ۔۔۔۔۔۔۔اور اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہ فتح وغنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے جو بیعتِ رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے' وہ مکہ کی فتح ہے چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوش خبری مسلمانوں کی سامعہ نواز ہوئی:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾ (فتح:۱)

''(اے محمد)! ہم نے تم کو فتح دی' فتح بھی صریح اور صاف۔''

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس فتح ونصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالمِ آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ○ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْهُ﴾ (نصر:۱۔۳)

''جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت چاہو۔''

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی' طاعات اور عبادات کی دعوت' فرائض وحقوق کی ادائی' قلوب ونفوس

کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی' ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی' اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا' اور عقائد و ایمان' شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہِ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں اس لیے وہ عرضاً مطلوب ہے' اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا﴾ (نور:۵۵)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔''

اس آیت میں خلافت کے عطا' خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو' اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادتِ الٰہی کی تعلیم اور ردِ شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے اس کی مسجد اس کا دیوان' اس کا منبر اس کا تخت تھا' اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی' جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپؐ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے' ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں' لیکن آپؐ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ (۱) کیونکہ آپؐ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی بادشاہی نہ تھی' بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد برحق کی بادشاہی کا قیام تھا' اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا' اس کے

(۱) سیرۃ ابن ہشام وفد روسائے قریش کی گفتگو۔

نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں' ایک ہی شہنشاہِ علی الاطلاق ہے جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ۔ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (زخرف:۸۴)

''اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔''

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی' اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی' نہ دیوتا ہوگا' اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ' جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا' اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا' سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے' (۱) مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے۔

﴿وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (مزمل:۲۰)

''(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔''

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ وسنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی' گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سر بکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی' سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ' اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے' اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں' اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورۂ حم السجدہ کی آیتیں پڑھیں جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا' اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد (ﷺ) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے' نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں' قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے

(۱) بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے' صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل و بیہقی و حاکم و احمد۔

ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا' اس لیے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو' اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی' اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی' لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا' اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

''اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو' جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو' ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو' ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو۔ تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا' تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں' اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں' اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔''

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں' مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے' نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں' اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا' یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آ جائے۔''

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی' جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی' اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا' لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی' یہ دنیا کی اصلاح' عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے' ابوطالب بھتیجے سے کہتے ہیں! جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں' ارشاد ہوا' اے عمِ بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں اور عجم ان کے زیرِ نگیں ہوگا' ابوجہل نے کہا: ہم آپؐ کی ایک نہیں دس باتیں مانیں گے'

ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں' اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔ (۱) حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں ''اے لوگو! کہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں' تم فلاح پاؤ گے' عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے۔'' (۲)

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسولِ انام علیہ السلام کے دستِ مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے' بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے' اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور کے دستِ مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ اب آپؐ اپنی شرطیں پیش فرمائیں' ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے' زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے' اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے' انصار نے ایک آواز سے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپؐ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح و نصرت۔ (۳)

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے' دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی' اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوش خبریاں دیں' جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا' مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے' حملہ

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام۔

(۲) طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۵' لائیڈن۔

(۳) طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹' لائیڈن۔

آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں' دم بہ بدم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے' آنحضرت ﷺ اور جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں۔ حضور تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر' پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں اور حضور ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں' اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ ان چند نہتے' فاقہ کش' غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے' لیکن مخبرِ صادق علیہ السلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے' مداین تمہارے ہاتھ آئے گا' قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے' مصر کا تخت تم کو ملے گا تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے' جنگ ہوگی' ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدانِ جہاد اور بحرِ روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا' بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔ (۱)

لیکن ان خوش خبریوں' بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت' یہ بادشاہی' یہ تخت' یہ تاج' یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں' یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں' اور اسلام کے حدود اور قانونِ عدل و انصاف کے اجرا کے ذریعے ہیں' اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت' شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے' اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت' یہ عیش و عشرت' یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال' سُوءِ مآل کا موجب ہو جائے گا' اسی لیے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں ان کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے' دنیا آخرت کی کھیتی ہے' یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز و فلاح کا موجب ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (شوریٰ:۲۰)

---

(۱) ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

''جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواست گار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواست گار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔''

﴿وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةَ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ سَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۵)

''اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔''

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔:

﴿وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾ (نحل:۴۱)

''اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔''

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (توبہ:۳۸)

''کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔''

﴿وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِنْ شَىْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (قصص:۶۰)

''اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔''

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○﴾ (اعلیٰ:۱۶۔۱۷)

''مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔''

﴿وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (اعراف : ۱۶۹)

''اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔''

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں۔

﴿فَاَذَا قَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (زمر:۲۶)

''پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش! یہ سمجھ رکھتے۔''

﴿وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰی﴾ (طٰہٰ:۱۲۷)

''اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔''

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَ هُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارَ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ○﴾ (ہود:۱۵۔۱۶)

''جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔''

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرِ کاہ سے بھی کمتر ہے:

﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ (توبہ:۳۸)

''دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔''

﴿وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ (رعد:۲۶)

''اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔''

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

﴿وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران:۱۸۵ و حدید:۲۰)

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔''

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے برتنا چاہیے جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے۔

﴿اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَ اِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ﴾

''دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرۃ:۲۹)

''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔''

پھر دوسری جگہ بتایا کہ انسان کس لیے بنا:

﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ﴾ (الذاریات:۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں' یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

﴿وَ ابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا﴾ (قصص: ۷۷)

''اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔''

انہی معنوں میں ﴿الدنیا مزرعة الاخرة﴾ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہلِ ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوش خبری دی گئی ہے' ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں' فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○﴾ (نور:۵۵-۵۶)

''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو' اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔''

خدا نے ایمان اور عملِ صالح والوں کو زمین کی سلطنت' تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے'

تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہو کر میری اطاعت عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجرا میں لگے رہیں' اور اگر اس امن واطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکامِ الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا' نماز کا قیام' زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ (حج:۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوقِ الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں' اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں' اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں' اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول' نہ خراج کا وصول' نہ غنیمت کی فراوانی' نہ دولت کی ارزانی' نہ تجارت کا فروغ' نہ جاہ ومنصب کا فریب' نہ عیش وعشرت کا دھوکا اور نہ شان وشوکت کا تماشا ہے بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی ومحنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبوی میں نظام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہلِ عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظامِ حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی۔ چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سرِ پُرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہِ ایران کا جواب اور قیصرِ روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق ومغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیرِ سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی وشامی حدود پر آ کر ملتے تھے عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب وتمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیرِ اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسطِ عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیرِ اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی جس کے فرمان روا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدودِ شام پر حکومت کرتا تھا یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم مہم یہ تھا کہ عرب کو غیر

قوموں کے دماغی تسلط' سیاسی مرعوبیت اوران کے اخلاقی وتمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کرنہ صرف عربوں کو' بلکہ سارے عالم کوانسانوں کے خودساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرمان برداری میں دے دیا جائے' اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہی ہے اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی' چنانچہ اگرچہ آپؐ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے مگر آپؐ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا تا کہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپؐ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (بقرہ:۱۴۳)

''اوراسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ اس امتِ مسلمہ کے لیے اور یہ امتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اوران کی تعلیم وتربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی تربیت خود اہلِ عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی' چنانچہ سب سے پہلے آپؐ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ' حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپؐ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح وہدایت کی نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ' ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلۂ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا' لیکن آپؐ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا' وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پر خطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب وہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپؐ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا' اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی' آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین ورؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دینا تھا۔ چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپؐ نے لکھا

تھا اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبولِ اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا۔ اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا' لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی' نجاشی بادشاہِ حبش نے آپؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپؐ کی خدمت میں روانہ کیا' یمن کے تمام روٴسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا' عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی' آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپؐ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا' اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا۔ اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا' چنانچہ حجۃ الوداع میں آپؐ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

﴿اَلْیَوْم اسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضُ﴾

''زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اسی دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔''

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین' سیاسی تکلفات' بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا' اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا' بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

﴿اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَ اِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرُ بَعْدَہٗ﴾

''جب کسری ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔''

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون' جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا' کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی' بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا' یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں حاکم ہے' شوہر اپنے اہل و عیال کا' بیوی شوہر کے گھر کی' معلم اپنے شاگردوں کا' آقا اپنے غلاموں کا' غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کا کہ ﴿کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ﴾ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا' یہی مطلب ہے۔ اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں' ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہِ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے' سب کو زیر کے

کرکے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خون ریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کی جد و جہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمان روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جد و جہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل وانصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی۔ عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنی شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار، اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجودِ بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو ونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ ایک پاک باز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتوِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نورِ ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور

خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی سب ایک ہی سطح پر آ کر کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہلِ عرب فطرۃً خوددار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پر دائر کی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے۔ عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اس قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیرِ اثر قائم ہوئی تھی وہ بھی اسی نقشہ پر تھی۔ قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا کہتا ہے:

و ننکر ان شئنا علی الناس قولھم

و لا ینکرون القول حین نقول

''اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے۔''

سردارانِ قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے، اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

((لاحمی الاحمی اللّٰہ و رسولہ)) ''اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔''

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے ان کے امرا علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قلم ان

مصنوعی تفریقوں کو مٹا دیا' نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کیے گئے' سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام ٹھہرے' امامِ وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا' حاجب ودربان کے پہرے اٹھ گئے' چاؤش ونقیب رخصت کر دیے گئے' طلائی ونقرئی وزمردیں تخت اٹھوا دیے گئے' امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے' اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی' چنانچہ وضعِ لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی قسم کا فرقِ مراتب موجود نہ تھا' ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے' چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ اس کو خرید لیں تا کہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپؐ کی خدمت میں آئیں تو آپؐ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربارِ عام کا دن ہے' آپ اس کو پہنیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ وجلال اور تزک واحتشام پر گئی جس کے شاہانِ وقت عادی تھے لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ وجلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے' آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپؐ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپؐ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں' لوگ اشارہ سے بتاتے' صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپ جلوہ افروز ہوں' مگر اس کو بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور بادشاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہلِ بیت رسول تھے' اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہلِ بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو' تو ان کے لیے دوہری سزا ہے ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپؐ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی' آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے ان کو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔ (۱)

ایک بار آپؐ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر

(۱) یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔

ٹوٹ پڑا' آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی' آپؐ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا' آپؐ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو' لیکن اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔ (۱)

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے' انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمایئے لیکن آپؐ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ (۲) ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا' جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانونِ عام نافذ ہوا تو سب سے پہلے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا' معاف فرمایا۔ اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں' بخلاف اس کے حضور ﷺ نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں' عبدیتِ کاملہ ہی آپؐ کا کمال تھا' اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا' آپؐ نے ان سب کو مٹا دیا۔ فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہِ شاہان کہے' ایک دفعہ آپؐ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لیے ہے' آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا چونکہ اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے' اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؓ کی موت کی طرف منسوب کر دیا' لیکن جب آنحضرت ﷺ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔ (۳)

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعبِ نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپؐ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں' میں تو اس عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا' اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں محمد کی

---

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸ کتاب الحدود۔

(۲) ابوداؤد۔

(۳) بخاری باب الکسوف۔

طرف رجوع نہیں کرتا' آپؐ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ (۱) حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جاسکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذاتِ شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپؐ نماز پڑھ رہے تھے' حالتِ نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: ''خداوندا! مجھ پر اور محمد پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔'' آپؐ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ''تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا۔ (۲) حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا' جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات ومحاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی وخاندانی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے' زکوٰۃ' صدقہ' خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیتِ امیرِ سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا' لیکن آپؐ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے' زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غربا اور اہلِ حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا' ابوداؤد میں ہے:

((فَالَ مَا اُوْتِیْکُمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ مَآ اَمْنَعُکُمْ اِنْ اَنَا اِلَّاخَازِنٌ اَضَعُ حَیْثُ مَا اُمِرْتُ)) (۳)

''میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں' میں صرف خزانچی ہوں جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔''

دوسرے موقع پر فرمایا:

((اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّ اللّٰہُ یُعْطِیْ))

''میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے۔''

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا' اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور اپنے اہلِ بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا' اسی طرح لڑائی کے بغیر جو

(۱) مسند ج ۳ ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریح۔

(۲) بخاری ج ۲ ص ۸۸۹۔ کتاب الادب۔

(۳) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والامارۃ۔

علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہِ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور اس کی آمدنی اپنی صوابدید سے اپنی خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے' چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپؐ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں' دیکھا تو آپؐ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی' ٹیک لگائے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں' حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا' ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے' اس منظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں' حضور نے رونے کا سبب پوچھا' عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپؐ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں' اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں' ارشاد ہوا کہ "اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا" حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ خدا آپؐ کی امت کو فارغ البال کرے کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں' آپؐ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو؟ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیے گئے ہیں۔"(۱)

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضورِ انور ﷺ کے لیے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے' جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع (۲) ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیسؓ بن سعد ایک صحابی تھے' وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ

---

(۱) بخاری و مسلم کتاب النکاح باب الایلا۔

(۲) یعنی پیوند دار کپڑا (معارف)

کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپؐ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ (۱) دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔ (۲)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور کو سجدہ کیا آپؐ نے حیرت سے فرمایا: معاذ یہ کیا؟ ''عرض کی! یا رسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ (۳)

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں۔ حیاتِ دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سر بلندی سے زائد نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکامِ الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفا کا حق اقویا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہریں تھیں، آپؐ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح

(۲) ابن ماجہ کتاب النکاح۔

(۳) ایضاً۔

پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔ (۱)

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی' اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی وعبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا' اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور ﷺ کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی' تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرضِ مدعا کرے نا آشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضور خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے' اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا' آپؐ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا' مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور کا یہ حکم بطورِ مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے:

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو برقرار رکھے یا توڑ دے۔ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی ایک لونڈی تھیں' وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی' ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا' انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپؐ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے' عرض کی تو قبول سے معذور ہوں' آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی مؤاخذہ نہیں فرمایا۔ (۲)

غزوۂ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا' فنِ جنگ کے بعض ماہر صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے' یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

((انتم اعلم بامور دنیا کم))

''تم اپنے دنیاوی معاملات میں (جن کا تعلق تجربات سے ہو) زیادہ واقف ہو۔''

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے' اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا' نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں'

---

(۱) یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں۔

(۲) صحیح بخاری باب تکون الحرۃ تحت العبد و باب شفاعۃ النبی ﷺ فی زوج بریرہؓ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے' اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا تو دریافت فرمایا' انہوں نے صورتِ حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی' تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو' ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے' میری اتباع ضروری ہے لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو۔ (۱)

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ خداوندی پر مبنی ہوتا' جس کی اطلاع حضور کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا' کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کیا پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بے شبہ ہوں' انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں' انہوں نے کہا' تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں۔؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا' وہ میری مدد کرے گا' انہوں نے کہا کہ کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی' انہوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے' آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا' روزے رکھے اور غلام آزاد کیا' (۲) اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی مگر حضور نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا' کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا' تو چونکہ ان کے شدتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا' جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے' ام المومنین نے چہرۂ مبارک پر

(۱) صحیح مسلم باب الفضائل۔

(۲) بخاری ج ۱ ص ۳۸۰ کتاب الشروط۔

آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا' آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا' حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں' آپؐ خود اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا' شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں' حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پروا نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا' اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا:(۱)

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی' ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور پر اعتراض کر بیٹھے' لیکن حضور نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابیؓ میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی' صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاریؓ کا۔ انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں' اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں' آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا' قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہے اسی کو پانی لینے کا حق ہے' دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ ''تم پہلے آب پاشی کر لو' پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو'' یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں' یہ سن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا' تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا' اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے (۲) یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے۔ قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمایئے! آپؐ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپ اجازت دیجیے تو

---

(۱) اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا۔ بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں' جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

(۲) ابوداؤد' کتاب الفقہ ج ۲ ص ۷۶۔

اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا۔ (۱) اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)۔

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرضِ واجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپؐ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت ﷺ اپنے کرم و شفقت سے اس پر تحمل فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اس طرزِ عمل میں آپؐ کے بعد آنے والے خلفا اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق گوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ عہدِ نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا "ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی" اور معترضین سے فرمایا کہ "تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔" (۲)

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضورِ انور ﷺ سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آ کر آپؐ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہو گئی آپؐ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہو گا اور نہ تمہارے باپ کا۔ حضور نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپؐ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ (۳)

اک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت

---

(۱) بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

(۲) صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکوۃ باب ارضاء السعاۃ۔

(۳) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب العلم۔

سختی سے گفتگو شروع کی۔ صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہم کلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے' اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ (۱)

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا' آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں' آپؐ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا' گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے۔ باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا' لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں' اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں' اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے' پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا اس نے پھر وہی لفظ کہے' لوگوں نے پھر روکا' آپؐ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو' اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے' جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے اس کا دل آپؐ کے حلم و عفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا' دیکھنے کے ساتھ ہی بولا "محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے' تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔" (۲)

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے' ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے' آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا' میعادِ ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت و سست کہہ کر کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔" حضرت عمرؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے' اس کی طرف منہ کر کے کہا "او خدا کے دشمن! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟" آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: "عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی' اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے' اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں" یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ "جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو" یہودی حلم و عفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (۳)

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا' اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا' پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا' اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے' حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے' آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا' اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا' مطلب یہ ہے کہ میرا

(۱) ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

(۲) مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸۔

(۳) یہ روایت بیہقی ۷ ابن حبان' طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی)

مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔ (۱)

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضورِ انور ﷺ جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے' لوگوں نے اس حیثیت سے آپؐ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا' آپؐ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا اور معاملہ کا فیصلہ کیا' یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کو تسلی کر دی۔ ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امرا کے غرور و تبختر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذاتِ شاہانہ ہر مؤاخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے۔ اس سے بھلا برا جو کچھ ہو' وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور' حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مؤاخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا' اور آپؐ کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی' باایں ہمہ آپؐ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپؐ کا یہ اسوہ آئندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تا کہ آئندہ والے امرا اور حکام استفسار و اظہارِ رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہدِ نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں' ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ سے اس رو در رو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا' یونان اور روما میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں' ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امرا کے مقابلے میں یہ حقِ سوال و مؤاخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع' اس خاکساری' اس عفو و حلم' اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا اور نہ آ سکتا تھا۔ وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگیٔ اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے' زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا' جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی۔ اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ یہ نفسِ امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے' بلکہ اس ذاتِ اقدس

(۱) جامع ترمذی کتاب البیوع۔

سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوٰت اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہلِ رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورِ انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپؐ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپؐ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپؐ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، اس لیے آپؐ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امرا کے لیے مثال و نظیر کا کام دے، آپؐ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (آل عمران :۱۵۹)

''اے رسول! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجیے۔''

چنانچہ حضور نے اس پر بہ نفسِ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ﴾ (شوریٰ:۳۸)

''ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔''

اگرچہ عہدِ نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع و استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضورِ انور ﷺ کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز با جماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپؐ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت

ﷺ کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی (۱) اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آ کر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا' چنانچہ آپؐ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہنچ کر آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی' یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑو۔ ہم تو یہیں رہیں گے خدا کی قسم! اگر آپؐ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپؐ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک تجربہ کار صحابیؓ نے آ کر عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ حسبِ فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے' اس پر انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے جہاں پانی اپنے قبضہ میں رہے' آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔ (۲)

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپؐ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے لوگوں نے مختلف رائیں دیں' آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔ (۳)

احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں' اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے' پھر پرجوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے اور حضور کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپؐ کے پاس آیا ہے واپس کر دیا جائے' آپؐ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے'

---

(۱) مصنف عبدالرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المراسیل لابی داؤد وفتح الباری ابن حجر وروض الانف سہیلی وزرقانی علی المواہب ونووی شرح مسلم باب بدءالاذان نووی میں ہے **فشرعه النبی صلی الله علیه وسلم بعد ذلک امابوحی او باجتهاده صلی الله علیه وسلم علی مذهب الجمهور فی جوازالاجتهاد له صلی الله علیه وسلم و لیس هو عملًا بمحرو المنام هذا ما لایشک فیه بالاختلاف۔**

(۲) ابوداؤد وترمذی باب بدءالاذان۔

(۳) ترمذی ۵۰۳ کتاب التفسیر سورۂ انفال۔

ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا' ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا' اور آپؐ نے ان کی درخوست قبول کر لی اگر چہ آنحضرت ﷺ کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی' پھر بھی آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہوکر آئے ہیں' اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے' جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو' وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں جس وقت آئندہ مال غنیمت آئے گا' ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا' تمام لوگ یک زبان ہوکر بول اٹھے کہ یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپؐ نے ان کے اس عاجلانہ اظہارِ رائے کو کافی نہیں سمجھا' فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے' اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے' چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپؐ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ (۱)

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہدِ مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا' اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی' بہیمیت' مکر وفریب' دغل وسازش' ظلم وستم اور جور وتعدی شامل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے۔ اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک وبلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا' احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اَلسُّلْطَانَ عَلَی اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ یَاْوِیْ اِلَیْہِ کُلُّ مَظْلُوْمٍ مِنْ عِبَادِاللّٰہِ۔ (۲) ''یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے' جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔'' حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ

اَلسُّلْطَانُ الْعَادِلُ الْمُتَوَاضِعُ ظِلُّ اللّٰہِ وَ رَحْمَۃٌ فِیْ الْاَرْضِ۔ (۳) ''عادل اور متواضع حاکم زمین

---

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد صحیح بخاری کتاب المغازی۔

(۱)' (۲) یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمرؓ بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے' یہ حضور ﷺ تک مرفوع نہیں' بظاہر ان حضرات صحابہؓ کے اقوال ہیں' تفصیل کے لیے دیکھیے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء ومزیل الالتباس عطاء حلبی لفظ سلطان۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں ''السلطان'' کے معنی بادشاہ کے نہیں' بلکہ طاقت وقوت کے ہیں' جو انگریزی لفظ ''پاور'' کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہے' اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں' سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے۔ ﴿اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ﴾ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے' یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لیے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا' بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔''

خود حضور ﷺ نے فرمایا: ''عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔''

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں' ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی' خیانت' فریب' سازش' تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدتِ معینہ کے لیے صلح کر لی تھی' لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں۔ ایک نامی اور مشہور صحابیؓ نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے' یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔ (۱)

ہر سلطنت کو ٹیکس مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتاً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی' اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب' مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا' اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے۔ یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے' ہر فرد رموزِ سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن باایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں' کبھی جرم کی پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں' لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں' باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے لیکن باایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا' بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی سلطنت کا نظامِ اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے' ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجبِ عذاب و ثواب سمجھتا ہے اس لیے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق

(۱) صحیح بخاری باب فضل من ترک الفواحش۔

اور روحانیت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا' صدقہ وزکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس وغربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ وزکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی' صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر وسررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا' ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں' لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں عبداللہ ابن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ فُلَانٍ فَاَتَاهُ اَبِىْ بِصَدَقَتِهٖ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِىْ اَوْفٰى۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۳:)

''آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما' چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ خداوندا! ابواوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔''

حضرت عدیؓ بن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا ملتا تھا جو عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انھی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ صَدَقَةٍ بَيَّضَتْ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ وُجُوْهَ اَصْحَابِهٖ صَدَقَةُ طَيِّئٍ جِئْتَ بِهَا. (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل)

''پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔''

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

''صَدَقَاتُ قَوْمِنَا''(۱)

---

(۱) مسلم ج ۲ کتاب الفضائل۔

''یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔''

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔ (۱)

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے بتھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بے تاب ہو جاتے تھے' چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہِ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں' زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں' یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے' انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا' جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے (صحیح مسلم باب الرجم) یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جاوے' آپؐ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا' انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے' اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپؐ اعراض فرماتے رہے چوتھی بار آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپؐ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا' جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابیؓ نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ (۲)

اس واقعہ سے قانونِ سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا' کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و کتاب الاجارۃ باب من اجر نفسہ۔

(۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۵ و صحیح بخاری کتاب الحدود۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا لیکن انہوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو' چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا حضور نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔ (۱)

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنہوں نے آ کر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے' گو ہم بستر نہیں ہوا' تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرمایئے۔ (۲)

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا' دونوں کے حامی اور طرف دار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا' آنحضرت ﷺ نے اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا۔ مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے' ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے' لیکن حضور نے دیت ہی پر زور دیا۔ یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمایئے۔ (۳)

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قائم کر دیتے ہیں' دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی' لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے' اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے' لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکمِ الٰہی کے بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی' دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے۔ لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے' ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے' بڑے بڑے جرائم سے درگزر کر سکتی ہے' رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہِ

(۱) ابوداؤد باب فی اقامۃ الحد علی المریض۔
(۲) ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع وصحیح بخاری حدود۔
(۳) ابوداؤد کتاب الدیات۔

سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی۔ عہدِ نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا' مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے' اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی۔ حاطبؓ ابن بلتعہ ایک صحابی تھے' انہوں نے کفارِ قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی' یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا' خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے' اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں' لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطبؓ نے کہا خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے' خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل واولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا' اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں' جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے' آپؐ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں' ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو' بدگمانی کو راہ نہ دو' لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا' خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے' اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں' لیکن آپؐ نے فرمایا کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں' کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَ جَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةَ﴾

''جو چاہو کرو' کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے (۱) آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے' اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے' لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا' لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باللہ' باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص و اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطبؓ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی' آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ)) (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸)

---

(۱) بخاریؒ جلد ۲ و کتاب المغازی ص ۵۶۰۔

''حسنِ ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔''

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (الحجرات:۱۲)

''بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی:

((اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَا ابْتَغَی الرِّیْبَۃَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ))

''جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔''

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

((عَنْ مُعَاوِیَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّکَ اِن اِتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَھُمْ وَ کِدتَّ اَنْ تُفْسِدَھُمْ))

''حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا ہے یا عن قریب برباد کر دو گے۔''

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا' تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی ڈاڑھی سے شراب ٹپکتی ہے' لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مؤاخذہ کرتے ہیں۔

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے' انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں' میں نے ان کو منع کیا' وہ لوگ باز نہیں آئے' اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ''درگزر کرو'' دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں' میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ ''درگزر کرو'' کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ:

((مَنْ رَّاٰی عَوْرَۃً فَسَتَرَھَا کَانَ کَمَنْ اَحْیٰی مَوْءُدَۃً)) (۱)

''جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔''

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا' لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے' بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ابن خلدون نے اس پر

(۱) یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النہی عن التجسس میں ہیں:

ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے' اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قولِ نبوی میں ملتا ہے' اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں' وہ لکھتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات' جسم' حسن' ڈیل ڈول' وسعتِ علم' حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا' ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے' اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے' اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے' اسی کا نام بادشاہی ہے۔ پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے' اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے' سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے' کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو' سخت گیر ہو لوگوں کے معائب کی کرید کرے' ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے' اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظامِ اخلاق برباد ہو جاتا ہے' وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں' اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے' اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے' جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطنت رعایا کے ساتھ نرمی کرے' ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں' اس کی محبت میں شرابور ہو جاتے اور اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں' پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے' سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے' لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں' مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے۔ جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے' نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے' اور وہ ابتدا ہی سے انجامِ کار کو پیش نظر رکھتے ہیں' اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ

یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئینِ جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اسی طرزِ عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکامِ سلطنت کے عدمِ تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثباتِ جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے چنانچہ فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ فِي الدُّنْيَا))

"بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔"

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ ایک بار حضرت ہشام بن حکیمؓ بن حزام کا گزر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔ (۱)

دنیوی حکمراں لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظامِ سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا، اور اس لیے یہ ابرِ کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپؐ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے،

(۱) مسلم ج ۲ ص ۳۹۷ کتاب الادب۔

مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا' چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر معبوث ہوئے ہیں۔ (۱) یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں' مجھ پر حد جاری فرمایئے' آپؐ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں' آپؐ نے دریافت فرمایا کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں' آپؐ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا۔ (۲)

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپؐ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی' ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا مجھے آپؐ سے ایک ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں' چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا۔ (۳) عدیؓ بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور بادشاہ ہیں یا نبی ہیں' لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپؐ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے' اور حضور ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے' ایک بدو نے ایک دفعہ آپؐ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپؐ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا۔ (۴) بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا' لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگ دستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے' تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے' ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے' اس سے بچنے کی تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار (۵) کر لیا لیکن آخر

---

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۹ کتاب الحدود۔

(۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۲ کتاب الحدود جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لیے بحکم ان الحسنات یذھبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوش خبری دی گئی۔

(۳) مسلم ج ۲ ص ۲۹۴۔

(۴) بخاری ج ۲ ص ۹۰۰۔

(۵) ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرماتِ شرعی سے تشبیہ دے دی جائے جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے' اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

ایک (۱) ایک رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کر لیا، آپؐ نے دو بار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کیا ہاں! ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو کہا ہے آپؐ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کر دو، انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپؐ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یا رسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپؐ نے فرمایا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپؐ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورۂ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ رویے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطینِ دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظامِ سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظامِ سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہدِ نبوت میں پیش آئے۔ ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں لیکن یہ کہ نفل پڑھو پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی و بیشی نہ کروں گا۔ یہ سن کر حضور نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا (بخاری کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپؐ کہتے ہیں کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں اور آپؐ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ

(۱) اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

کہا' اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا' اللہ تعالیٰ نے' اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا اللہ تعالیٰ نے' اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا اللہ عزوجل نے' اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا اور پہاڑ کو کھڑا کیا' اور ان میں فائدے رکھے کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ ؐ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں' اس نے پھر عرض کی کہ آپ ؐ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا' کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ؐ کو بھیجا کیا خدا نے آپ ؐ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بے شک پھر کہا! آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا ہاں! سچ کہا' اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ ؐ کو رسول بنایا کیا خدا نے آپ ؐ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں' فرمایا: ہاں' سچ کہا۔ عرض کی اس کی قسم جس نے آپ ؐ کو بھیجا' کیا خدا نے اس کا حکم دیا فرمایا ہاں۔ اس نے عرض کی قسم ہے اس کی جس نے آپ ؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔ (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہؓ حاضر خدمت تھے اور حضور ؐ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا' پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا' پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور نے فرمایا ہاں کہو اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا' فرمایا جو چاہو پوچھو' اس نے کہا کہ میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ ؐ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا خدایا ہاں پھر کہا خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ ؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ ؐ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا خدایا ہاں اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ؐ آئے ہیں' اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہوں (بخاری کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی' بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھیے اور شیفتگی و جانثاری کا ایک اور واقعہ سنئے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت ﷺ کے جانثار تھے' وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا' براء بن عازبؓ ایک صحابیؓ تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے' بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابوداؤد کتاب

الحدود ج۲ ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوشِ عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپؐ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم وایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آپؐ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی ڈاڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپؐ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپؐ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہؓ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپؐ کا لعاب دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں۔ جب آپؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپؐ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظرِ جاہ و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہوں جس قدر محمد ﷺ کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے۔ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے، جب آپؐ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔ (۱)

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصارؓ سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے انہوں نے کہا:

اِیَّانَا نُرِیْدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نُخِیْضَھَا الْبَحْرَ لَاَخُضْنَاھَا وَ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَضْرِبَ اَکْبَادَھَا اِلٰی بَرْکِ الْغِمَادِ لَفَعَلْنَا۔ (مسلم کتاب الجہاد باب غزوۂ بدر)

''یارسول اللہ کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر آپؐ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد (۲) پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔'' غزوۂ احد میں جب آپؐ نے کفار کی

(۱) بخاری ج ۱ ص ۳۷۷ کتاب الشروط۔

(۲) یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا' اس سے زیادہ جوشِ محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے انہوں نے کہا:

بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیَ لَاتَشْرَفْ یُصِبْکَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ الْقَوْمِ نَحْرِیْ دُوْنَ نَحْرِکَ.

(بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد)

''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپؐ گردن بڑھا کر نہ دیکھیے کہیں آپؐ کو کوئی تیر نہ لگ جائے' میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔''

خیر یہ تو صحابہؓ اور حضور انور ﷺ کے درمیان واقعات تھے' آنحضرت ﷺ کے صحبت یافتہ یعنی صحابہؓ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا' چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا' تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں' فتحِ خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو مقرر فرمایا' وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی' اس پر یہودیوں نے کہا ''یہ تو بہت ہے'' انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں' تم لوگ اس کا نصف لے لینا' اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

هٰذَا الْحَقُّ بِهٖ تَقُوْمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ قَدْ رَضِیْنَا اَنْ تَاْخُذَهٗ بِالَّذِیْ قُلْتَ۔ (۱)

''انصاف اسی کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔''

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی' لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم! میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں' جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سؤروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان، و زمین اسی انصاف سے قائم ہے۔ (۲)

❀❀❀

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۵۷ کتاب البیوع۔

(۲) فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۳۱

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں' ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو [1] اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے' اسی بنا پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی' دین داری' صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی' یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثال ہیں۔

اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے' ایک ہی رہا ہے' اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ﴾ ''خدا کے نزدیک دین اسلام ہے'' اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے' انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے' وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین جو سرتاپا سلطنت ہے مگر سلطنتِ الٰہی' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق' اللہ تعالیٰ ہے۔ جل شانہ وتعالیٰ اسمہ۔

بادشاہی اسی کی ہے' حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو' یا اس پر مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی' نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر' حاکم اور فرمان روا تھے آپؐ کے احکام کی بجا آوری عین خدا کے احکام کی بجا آوری ہے:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (نساء:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔''

---

(۱) انجیل۔

آپؐ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپؐ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمان روا تھے' اسی طرح وہ دین کے پیشوا' امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں' ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں' آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

"مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَ مَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ"

"جس نے میرے امیر کا کہا مانا' اس نے میرا کہا مانا' جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔"

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے' احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے' یہاں تک کہ امرا کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امرا اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے' بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو۔ غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و غایت سے ہے' خدا کے لیے اور خدا کی خوش نودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکمِ الٰہی کیا جائے وہ دین ہے امام کی امامت' خلیفہ کی خلافت' راعی کی رعیت' والی کی ولایت' امیر کی امارت' حاکم کی حکومت' رعایا کی نگرانی' قاضی کی دادگیری' عمال کا عمل' سپاہی کا قتال' مجاہد کا جہاد' محاصل کی ادائی' امرا کی واجبی اطاعت۔ غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لیے کیا جائے وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امرا اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں' جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے۔ فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں' حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے' قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے' حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت' ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساسِ فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا:(۱)

(۱) صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲ ص ۲۲۳ مصر۔

﴿وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ○ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ○ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (صٓ :۲۴۔۲۶)

''اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے۔ اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔''

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے' تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ اِمَامٍ يُغْلِقُ بَابَهٗ مِنْ ذَوِى الْحَاجَةِ وَ الْخُلَّةِ وَ الْمَسْكَنَةِ اِلَّا اَغْلَقَ اللّٰهُ اَبْوَابَ السَّمَآءِ دُوْنَ خُلَّتِهٖ وَ حَاجَتِهٖ وَ مَسْكَنَتِهٖ)) (ترمذی ابواب الاحکام:۲۲۷)

''جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔''

((مَنْ وَلِىَ مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ شَيْئًا فَاحْتَجَبَ دُوْنَ خُلَّتِهِمْ وَ حَاجَتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ وَ فَاقَتِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ يَوْمُ الْقِيَامَةِ دُوْنَ خُلَّتِهٖ وَ فَاقَتِهٖ وَ فَقْرِهٖ)) (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ۴۲ ص ۹۳ حیدر آباد)

''جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔''

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی'(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی

(۱) چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کیلئے اذن کا حکم ہے اس لیے خود آنحضرتؐ نے اور خلفا نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات' مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

تھے' اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا' وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی' حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے (ابن حنبل ج ا ص ۵۴ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابیؓ نے ان کو اس حکم نبویؐ سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہلِ حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے (ترمذی' ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے' خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○﴾ (نساء:۵۸-۵۹)

''امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو' اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو' خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے' بے شک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے' مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمان برداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحبِ حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو' یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔''

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں' جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے' اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے' امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے:

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ﴾ (رحمٰن:۹)

''اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو' اور میزان میں کمی نہ کرو۔''

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو' اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ (مطففین:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔''

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے اور خلافِ انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا' اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (مائدہ:۴۲ وحجرات:۹)

''اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والے کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَ اللّٰهُ لَايُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (آل عمران:۵۷)

''اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿اِنَّه لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (شوریٰ:۴۰)

''بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں' چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو' یا عام بندوں کا ہو' یا خدا تعالیٰ کا ہو ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (مائدہ:۴۷)

''اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔''

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں ارشاد ہے:

((اَلَا اَيُّهَا النَّاسُ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ اِمَامٍ حَكَمَ بِغَيْرِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ)) (مستدرک ج۴ ص۸۹' کتاب الاحکام)

''ہاں اے لوگو! جو امام خدا نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے' اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔''

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے' وہ

منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمان روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے' اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں' فرمایا:

((اَلْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ هُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ)) (صحیح بخاری ج ۲' ص ۵۷ کتاب الاحکام)

"وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے اس سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔"

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں' اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں' ذمہ داریوں کا خارزار ہے' جو اس سے بسلامت گزر گیا' اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

مَامِنْ عَبْدٍ یَسْتَرْعِیَهُ اللّٰهُ رِعِیَّةً فَلَمْ یَحِطْهَا بِنَصِیْحَةٍ اِلَّا لَمْ یَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ. (بخاری و مسلم حوالہ سابق)

"جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔"

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا۔ انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے:

((مَا مِنْ عَبْدٍ یَّسْتَرْعِیَهُ اللّٰهُ رَعِیَّةً یَّمُوْتُ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ هُوَ غَاشٌّ لِرَعِیَّتِهٖ اِلَّاحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةُ)) (مسلم کتاب الامارہ)

"جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے' وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔"

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے' ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے' عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے

اوراس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

((اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَۃُ)) (مسلم کتاب الامارہ)

''سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔''

تو تو ان میں سے نہ بن' اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں' فوراً بولے: کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا' بھوسی تو اوروں میں تھے' اوران کے بعد والے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیا فرمایا کرتے تھے' ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا' لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا' نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے' انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی' صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو' پھر اس کے بعد والے کی پھر عہد بہ عہد اوروں کی' ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

((فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاھُمْ)) (صحیح بخاری)

''کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔''

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امرا کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰھُمَّ مَنْ وَّلِیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِیْ شَیْئًا فَشَقَّ عَلَیْھِمْ فَاشْقُقْ عَلَیْہِ وَ مَنْ وَّلِیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِیْ شَیْئًا فَرَفَقَ بِھِمْ فَارْفُقْ بِہٖ)) (مسلم)

''اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔''

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں' اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے' ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ وَ الرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ وَ ھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْھُمْ وَ الْمِرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ بَعْلِھَا وَ وَلَدِہٖ وَ ھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ وَ الْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ وَ ھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْہُ اَلَا فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) (مسلم وصحیح بخاری)

''ہاں! تم سب نگران کار ہو' اور تم سب سے اپنے زیرِ نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کے امیر نگران کار سے اس کے زیرِ نگراں کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں

منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمان روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے' اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں' فرمایا:

((اَلْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ هُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ)) (صحیح بخاری ج ۲' ص ۵۷ کتاب الاحکام)

''وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے اس سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں' اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں' ذمہ داریوں کا خارزار ہے' جو اس سے بسلامت گزر گیا' اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

مَامِنْ عَبْدٍ یَسْتَرْعِیَهُ اللّٰهُ رِعِیَّةً فَلَمْ یَحِطْهَا بِنَصِیْحَةٍ اِلَّا لَمْ یَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ. (بخاری و مسلم حوالہ سابق)

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔''

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا۔ انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے:

((مَا مِنْ عَبْدٍ یَّسْتَرْعِیَهُ اللّٰهُ رَعِیَّةً یَّمُوْتُ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ هُوَ غَاشٌّ لِرَعِیَّتِهٖ اِلَّاحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةُ)) (مسلم کتاب الامارہ)

''جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے' وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔''

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے' ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے' عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم وامیر عدل وانصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے فرمایا:

((مَا مِنْ اَمِيْرٍ يَلِى اَمْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ اَلاَلَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ)) (صحیح مسلم کتاب الامارۃ)

''جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔''

((مَا مَن وَّالٍ يَلِى رَعِيَّةَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَ هُوَ غَاشٍ لَّهُمْ اَلا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ)) (صحیح بخاری کتاب الاحکام)

''کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرِ نگرانی جماعت کا والی ہو وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو اس پر جنت حرام ہے۔''

((اِنَّمَا الْاِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتِلُ مِن وَّرَآئِهٖ وَ يَتَّقِىْ بِهٖ فَاِنْ اَمَرَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَ عَدَلَ فَاِنَّ لَهٗ بِذَالِکَ اَجْرًا وَّ اِنْ اَمَرَ بِغَيْرِهٖ فَاِنَّ عَلَيْهِ وِزْرًا)) (نسائی کتاب البیعۃ)

''امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔''

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت وریاست اور سلطنت وولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب وعذاب اور جزا وسزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال وعبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت وولایت اور حکومت وریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام وانصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیا کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل وتدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیے۔ حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش[1]
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

(۱) حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہوسکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار ومصالح کے تلاش نہیں کرنی چاہیے جب کہ ←

''اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے' زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز واسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں تم کو ان سے کیا سروکار''!

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں' اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور اجرا کے لیے ہے اور یہ عین دین ہے۔ اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے' اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعیِ اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضراتِ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں' اس سے مقصودِ اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ' تنفیذ اور اجرا ہی تھا' جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے' اور میدانِ جہاد کے صبر وثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے' قرآن میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ○ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ (انفال:۱۵۔۱۶)

''اے اہل ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان پر پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے' ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔''

﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں' یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔''

یہی سبب ہے کہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جہاد وقتالِ فی سبیل اللہ' انصاف' اقامتِ دین' تنفیذِ حکم' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت وخلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے' عام عبادات واعمالِ صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے' حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد وقتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

← دنیا کے بادشاہ اپنے رموز ومصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے' اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز واسرار کی تلاش وطلب نہیں کرنی چاہیے۔

﴿فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قَاتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّئَاتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آل عمران:۱۹۵)

''تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔''

خود لفظ دین قرآنِ پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے' ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت' تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں' سورۂ نور میں ہے:

﴿وَ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ﴾ (نور:۲)

''اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔''

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجرا سے ہے اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ﴾ (بقرہ:۱۹۳)

''اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔''

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو ''دین'' فرمایا گیا ہے سورۂ انفال کی اس آیت میں

﴿وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَ یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (انفال:۳۹)

''اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔''

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے' یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے' اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (انعام:۵۷' یوسف:۴۰) ﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾ (انعام:۶۲)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا﴾ (نحل:۵۲)

''اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔''

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت وولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش وتنعم کے ایوانِ زرنگار' تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں' یا جلال وجبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سائے میں' لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے' بلکہ اسلام نے سلطنت' حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے' قطعاً چھوڑ دیا' سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا' ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے' مگر تعلیمِ محمدی نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے' پرہیز کیا' الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا' اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے' چنانچہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِکِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○﴾ (الناس:۱۔۳)

''کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں' لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی لوگوں کے معبودِ برحق کی۔''

﴿اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ﴾ (حشر:۳)

''بادشاہ حقیقی پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔''

﴿فَتَعَالَی اللّٰهُ الْمَلِکُ الْحَقُّ﴾ (مومنون:۱۱۶)

''تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔''

﴿اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ (جمعہ:۱)

''بادشاہِ حقیقی' پاک ذات' زبردست' حکمت والا ہے۔''

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ''اَلْمَلِکُ الْحَقُّ'' یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے' یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے' ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے' بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے' مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو مَلِکُ النَّاس ''لوگوں کا بادشاہ'' کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رَبُّ النَّاس ''لوگوں کا پالن ہار'' بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو' دوسری آیت میں اَلْمَلِکُ کے ساتھ اول اَلْقُدُّوْسُ (مقدس وپاک) اور پھر اَلسَّلَامُ

(امن وامان والا) کہا گیا ہے' تا کہ اس کے ساتھ اس کی پاکی وسلامتی ظاہر ہو جائے' تیسری آیت میں الملک کے ساتھ اَلْحَقُّ (برحق کی صفت آئی ہے) چوتھی آیت میں اَلْمَلِکُ کے ساتھ اَلْقُدُّوْسُ (پاک) اَلْعَزِیْزُ (غالب) اَلْحَکِیْمُ (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم وسفا کی' قہر وجبر اور بے رحمی وسخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہِ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہِ شاہان' شہنشاہ' ملک الملوک صرف ایک ہے' اور وہ اللہ تعالیٰ ہے آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اَخْنَعَ الْاَسْمَآءَ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ تُسَمَّی مَلِکُ الْاَمْلَاکَ)) (صحیح بخاری کتاب الادب)

''سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔''

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے' خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم وفرمان روا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآنِ پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے' مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں۔ توراۃ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغازِ پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے' لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے' اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلّف ہونا' اس کا اصلی مقام بہشت ہونا جزا وسزا کا راز' رسالت ونبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے' دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام ومرتبہ کی تعیین' دنیا میں اس کے فرائض' احکامِ الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔ (۱)

---

(۱) خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیتِ استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے' یہ مضمون آج بھی پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہے۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بقرہ :۳۰)

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے' جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے' اس لیے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے' چنانچہ فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنَاھُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاھُمْ مِّنَ الطَّیِّبَاتِ وَ فَضَّلْنَاھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۰)

''ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدم بنی آدم کے قائم مقام تھے' ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے۔

﴿اِھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۳۸)

''تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ' اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے' تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔''

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ لَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَالَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ○وَلَقَدْ خَلَقْنَاکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّا اِبْلِیْسَ لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ﴾ (اعراف:۱۰۔۱۱)

''اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی' اس لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوعِ آدم کو نصیب ہوئی' سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ

فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّه لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (انعام:۱۶۵)

''اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا' تا کہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بے شک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشنے والا' مہربان ہے۔''

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے' جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین فرمایا:

﴿وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ ۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ (اعراف:۹)

''اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح علیہ السلام کے بعد جانشینی بخشی۔''

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

﴿وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ﴾ (اعراف:۷۴)

''اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔''

حضرت ہودؑ اپنی قومِ عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری نہ کی۔

﴿وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ﴾ (ہود:۵۷)

''تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔''

حضور انور ﷺ کی زبان مبارک سے ارشاد ہے:

﴿اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَ یَسْتَخْلِفْ مِنْ ۢ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ﴾ (انعام:۱۳۳)

''اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔''

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ (نور:۵۵)

''اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔''

قرآنِ پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلَآئِفَ الْاَرْضِ﴾ (انعام:۱۶۵)

''اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا۔''

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس:۱۳۔۱۴)

''اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب انہوں نے ظلم اختیار کیا ہلاک کر چکے ہیں' اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے' مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔''

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ﴾ (یونس:۷۳)

''لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔''

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ﴾ (فاطر:۳۹)

''وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا تو جس نے کفر کیا' اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔''

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (صٓ:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے' تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔''

یہ لفظ خلیفہ ﴿خَلَفَ﴾ سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو' یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو' اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

(۱) ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ (اعراف:۱۶۹ و مریم:۵۹)

''تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔''

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے' دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا۔

﴿وَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ﴾ (اعراف:۱۴۲)

''میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔''

یہ زندگی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

(۲) ﴿وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ﴾ (زخرف:۶۰)

''اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔''

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے' پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں' دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں' اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے' بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے' بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا' اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں' لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

اَلْخِلَافَةُ اَلنِّيابة عَنِ الْغَيْرِ اَمَّا لِغَيْبَةِ الْمَنُوْبِ عَنْهُ وَ اَمَّا لِمَوْتِهٖ وَ اَمَّا لِعِجْزِهٖ وَ اَمَّا لِتَشْرِيْفِ الْمُسْتَخْلِفِ. (صَ :۱۵۵مصر)

''خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں' اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو' یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو' یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔''

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں' جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں' مفتی آلوسی صاحبِ روح المعانی نے ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہییں' میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی اس اصول پر قرآنِ پاک کی ہر ان آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے' اس کی جانشینی مراد ہوگی اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلمِ قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی' جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ (حدید:۷)

''اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔''

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے' اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں' کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے' کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے' اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے' میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں کشاف بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا گیا ہے کشاف میں ہے:

اِنَّ الْاَمْوَالَ الَّتِیْ فِیْ اَیْدِیْکُمْ اِنَّمَا هِیَ اَمْوَالُ اللّٰهِ بِخَلْقِهٖ وَ اَنْشَاَهٗ لَهَا وَ اِنَّمَا مَوَّلَکُمْ اِیَّاهَا وَ خَوَّلَکُمْ لِلْاِسْتِمْتَاعِ بِهَا وَ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ فِی التَّصَرُّفِ فِیْهَا۔

''وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے' اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔''

بیضاوی میں ہے:

مِنَ الْاَمْوَالِ الَّتِیْ جَعَلَکُمُ اللّٰهُ خُلَفَآءَ فِی التَّصَرُّفِ فِیْهَا۔

''وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔''

روح المعانی میں ہے:

﴿جَعَلَکُمْ سُبْحَانَهٗ خُلَفَآءَ عَنْهُ عَزَّوَجَلَّ فِی التَّصَرُّفِ فِیْهِ مِنْ غَیْرِ اَنْ تَمْلِکُوْهُ حَقِیْقَةً﴾

''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے' نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے' اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے' یعنی:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (بقرہ:۳۰)

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں' ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے' دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے' حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے:

((اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً مِّنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُکْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ))

''میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان

حکم کرنے میں۔"

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَخْبِرُ الْمَلٰئِکَۃَ اَنَّہٗ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً لَّہٗ یَحْکُمُ فِیْھَا بَیْنَ خَلْقِہٖ بِحُکْمِہٖ. (ص۱۰۴مصر)

"اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔"

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

وَ الْمُرَادُ بِہٖ اٰدَمُ عَلَیْہِ السَّلَامُ لِاَنَّہٗ کَانَ خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِیْ اَرْضِہٖ وَ کَذٰلِکَ کُلُّ نَبِیٍّ اُسْتُخْلِفَھُمْ فِیْ عِمَارَۃِ الْاَرْضِ وَ سِیَاسَۃِ النَّاسِ وَ تَکْمِیْلِ نُفُوْسِھِمْ وَ تَنْفِیْذِ اَمْرِہٖ فِیْھِمْ لَا حَاجَۃَ بِہٖ تَعَالٰی اِلٰی مَنْ یَّنُوْبُہٖ بَلْ لِقُصُوْرِ قَبْضَۃٍ وَ تَلَقِّیْ اَمْرَہٗ بِغَیْرِ وَسْطٍ۔

"اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں' کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے' اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا' زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو' بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔"

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلا فرمایا ہے' یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے' اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

(۱) تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

(۲) روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا' اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی' لیکن جس اہتمام سے' جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش' اللہ کی نیابت' فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ' پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کیے گئے ہیں ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا' یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں' بلکہ خالق کی تھی۔

(۳) اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی' اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی' اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں

لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی' جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا' اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے' یا سیاق وسباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی' اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتًا خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے' اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے' جس کا آدمؑ کو نائب بنانا سمجھا جائے' ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

(۴) اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف وکرامت کا اظہار ہوتا ہے' فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۰)

''ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں' اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں' اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین:۴)

''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔''

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (جاثیہ:۱۳)

''اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں' ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا' بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔''

اور یہی نیابتِ الٰہی کی حقیقت ہے' قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے' مزید تشریح کیلئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

﴿وَ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (بقرہ :۲۹)

''اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔''

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ﴾ (نمل:۱۲)

''اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ﴾ (جاثیہ:۱۲)

''اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔''

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (ابراہیم:۳۲)

''اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا۔''

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ﴾ (ابراہیم:۳۲)

''اور نہروں کو بھی تمہارے زیرِ فرمان کیا۔''

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصودِ اصلی ہے' اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے' اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے' ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (احزاب:۷۲)

''ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے' اور انسان نے اس کو اٹھا لیا' بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔''

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے' یہ امانتِ الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے' نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے' اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے' جو اس کو ملی ہے' تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریتاً ملے ہیں' یہ حدیث کہ خلق اللّٰہ ادم علی صورتہ۔ ''اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے'' اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ﴿تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کے اخلاق سے متصف ہو'' کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے' اور جس کے اندر مادی و روحانی' سیاسی اور اخلاقی' دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریبان ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلقِ عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے' قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی ہے ﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ ''میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں'' اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے' اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے' اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔ وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

امتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہلِ سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لیے خاتم الانبیاؑ ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپؐ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لیے قرآن پاک اور احادیثِ نبوی میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخَرِيْنَ﴾ (واقعہ:۳۹۔۴۰)

''ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔''

﴿وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ (جمعہ:۳)

''اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ انبیا کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز ۶۔۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا کی آخری امت ہے، صحیح بخاری

و مسلم ونسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:(۱)

نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ.

''ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔''

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں' لیکن اجر وثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے' حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم' بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز:۶۔۲۳۰)

ابن ماجہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

نَحْنُ اٰخِرُ الْاُمَمِ. (کنز۶:۲۳۰)

''ہم سب سے آخری امت ہیں۔''

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لیے قیامت تک اس میں اہلِ حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب ومنصور رہے گا' جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہلِ عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآنِ پاک قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا' گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالمِ تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسباب وعلل کا واسطہ رکھا ہے' اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا' اس کے بعد پورا فرمایا' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے' تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا' اسی لیے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملینِ قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا' اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امتِ محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے' ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ مِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾ (اعراف:۱۸۱)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر۔

''ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)۔''

اہلِ تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے' یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔ (۱)

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ﴾ (آل عمران:۵۵)

''اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں' گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں' اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں' (۲) مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں گو گمراہ ہوں' (۳) بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک قائم رہنے والے ہیں' اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں' یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہو جائے جیسا کہ نزولِ مسیح (۴) کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

لَا تَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَ لَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ عَلٰی ذٰلِکَ. (بخاری' علامات النبوۃ)

''میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا' اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آ جائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔''

لَایَزَالُ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ حَتّٰی یَاْتِیَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ ظَاهِرُوْنَ (بخاری علامات النبوۃ)

''میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آ جائے گی۔''

لَایَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ قَوْمٌ ظَاهِرِیْنَ عَلَی النَّاسِ حَتّٰی یَاْتِیَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ. (بخاری کتاب التوحید)

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا' یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔''

لَایَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَایَضُرُّهُمْ مَنْ کَذَّبَهُمْ وَ لَا مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ

---

(۱) تفسیر خازن تفسیر آیت مذکور۔

(۲) تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ۔

(۳) تفسیر روح المعانی۔

(۴) تفسیر آیت مذکورہ۔

اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ (بخاری کتاب التوحید)

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔''

لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى یَأْتِیَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كَذٰلِكَ. (مسلم کتاب الامارۃ)

''میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی' اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔''

لَنْ یَّبْرَحَ هٰذَا الدِّیْنَ قَائِمًا یُّقَاتِلُ عَلَیْهِ عُصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ حَتّٰى تَقُوْمُ السَّاعَةُ (مسلم کتاب الامارۃ)

''یہ دینِ اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی' یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔''

لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ اِلٰى یَوْمِ الْقِیَامَةِ. (مسلم کتاب الامارہ)

''میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔''

لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ قَآئِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَایَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ اَوْخَالَفَهُمْ حَتّٰى یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ ظَاهِرُوْنَ عَلَى النَّاسِ. (مسلم کتاب الامارہ)

''میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکامِ الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے' ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔''

وَ لَا تَزَالُ عُصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیَامَةِ. (مسلم کتاب الامارہ)

''مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی' اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔''

لَاتَزَالُ عُصَابَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ قَاهِرِیْنَ لِعَدُوِّهِمْ لَایَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى یَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ وَ هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ. (مسلم: کتاب الامارہ)

''میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔''

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں' حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم' جامع ترمذی' سنن نسائی' ابوداؤد' ابن ماجہ' ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں (۱) اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسکینِ خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا تا کہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی ایک حدیث ہے۔ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔

یعنی امت محمدی کے علما انبیا کے وارث ہیں' ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگیا' بلکہ انہیں نبوت کے فضائل وکمالات وفرائض سے ان کے حسبِ استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا' اور وہ تبلیغِ دین' ہدایت خلق' دعوتِ حق' اقامتِ دین' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دفعِ شبہات ابطالِ مبطلین اور ردِ بدعات وغیرہ ہیں۔ اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔ (۲)

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں' چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضورِ انور ﷺ کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی' تو یہ امتیں بیک زبان امتِ محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

كَادَتْ هٰذِهِ الْاُمَّةُ اَنْ تَكُوْنَ اَنْبِيَاءَ كُلُّهَا. (مسند طیالسی ص ۳۵۴ عن ابن عباس و مسند احمد و ابویعلیٰ)

''قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیا کا مرتبہ پائیں۔''

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰت اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے' صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امتِ محمدیہ سے لیا جائے گا۔ (۳) یہ شاید اس لیے ہوگا کہ امتِ محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے' حضرت عبادہؓ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے:

''اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں' ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد

---

(۱) دیکھیے کنز العمال ج ۶' ص ۲۳۱' ۲۳۵۔

(۲) یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرقِ متعدد مروی ہے اور محدثین نے اس لیے اس کو معتبر مانا ہے' دیکھیے مقاصدِ حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی ص ۶۴۔

(۳) حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

ہے:

﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (مومن:۶۰)

''مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔''

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیا کو حاصل تھا اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج:۷۸)

''اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔''

اور یہ بھی صرف انبیا کو کہا گیا تھا' اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔''

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امتِ محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں' وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں' قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امتِ محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

''شہید'' اور ''شاہد'' کے لغوی معنی ''حاضر'' کے ہیں کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے' مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لیے' اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے' اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے' اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لیے' اس کو امورِ خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے' اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسبِ سیاق وسباق بولا جاتا ہے' جس کا اندازہ حسبِ ذیل آیتوں سے ہوگا:

(۱) حمایتی اور مددگار کے معنی ہیں:

﴿وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَ کُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (بقرہ:۲۳)

''اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)۔''

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿وَ لَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۸۸)

''اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔''

(۲) ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ﴾ (حج:۱۷)

''اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

(۳) کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ (مائدہ:۱۱۷)

''(حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا نگران رہا۔''

(۴) گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (نساء:۴۱)

''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔''

(۵) امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (بقرہ:۱۴۳)

''اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تا کہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔''

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امتِ محمدیہ جو آخری امت ہے اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگرانِ کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا، پیغامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امتِ محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے۔ چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گی، جیسا کہ صحیح بخاری

میں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے' وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں! میرے رب۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی' وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا۔ تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا' تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد اور ان کی امت۔ تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے' یہ ارشاد فرما کر حضورِ انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (بقرۃ:۱۴۳)

''یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

حافظ ابنِ کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے' ورنہ امتِ محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی' اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا' کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جز ہے یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے' قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

﴿هُوَا اجْتَبٰكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (حج:۷۸)

''اسی اللہ نے (اے امتِ محمدیہ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی' تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا اور اس قرآن میں بھی تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔''

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں' ﴿اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (عادل و معتدل امت) ﴿خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ (سب سے بہتر امت) ﴿هُوَا اجْتَبٰكُمْ﴾ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری' اور فضیلت پر شاہد ہیں' بلکہ وصف ﴿اِجْتَبٰكُمْ﴾ (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امتِ محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہدِ عادل حضرت محمد رسول

اللہ ﷺ ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں وہ نبی ﷺ کی امتِ دعوت ہیں، حضورِ انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ امتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں، اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ تا بہ قیامت امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے۔ یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امتِ محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حسب ذیل فرمائی ہے:

تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے تو اس نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی بعثتِ ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ: باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (جمعہ:۲)

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔''

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔''

اور حدیثِ صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا بَعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَ لَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ﴾

''تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ ایک پیغامِ حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے معبوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور ﷺ کا حجۃ الوادع میں اخیر حکم:

فلیبلغ الشاهد الغائب۔ ''میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے' وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔''

صرف حضور انور ﷺ کے عہدِ مبارک تک کے لیے محدود نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے یہ جاری وساری ہے' فرمایا گیا ہے کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (توبہ:۱۲۲)

''تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ (دین کا) علم سیکھتے' اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔''

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے' جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو' اچھی باتوں کو بتاتے ہو' اور بری باتوں سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیے سرفروشی کرے' اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ امتِ محمدیہ کی فلاح اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت وتبلیغ میں مضمر تھی' جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت وشوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں' لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا' امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا' مگر انشاء اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا﴾ (توبہ:

۳۹)

''اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرمان بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔''

پھر فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (مائدہ:۵۴)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں' یہ خدا کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی' اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی' اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی' کفار کے مقابلہ میں سخت ہو گی' اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی' اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروانہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ○﴾ (حج:۷۷۔۷۸)

''مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تا کہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے' اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اس سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا' اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تا کہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔''

ان آیتوں سے اس شاہدِ امم اور مجتبائے عالم امت کے حسبِ ذیل آثار وعلامات ہیں:

(۱) ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی (۲) ادائے زکوٰۃ پر عامل (۳) ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط (۴) رکوع وسجود وعباداتِ الٰہی کی خوگر (۵) امورِ خیر پر حریص (۶) راہِ حق میں جہاد اور فدا کاری پر آمادہ رہنے والی۔

امتِ محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی ان شاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقا اور قیام اور غلبہ وشوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظّم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے' اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو۔ انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا' اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا' جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا' پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا۔ ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا صلہ سمجھنے کے بجائے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوقِ بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا۔ اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا' جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی' ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی' یعنی کوئی سورج دیوتا کا نورِ نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا' اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے' اور مصر کے فرعون اپنے کو رع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا' چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے' اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء۔ (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا' یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے' ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ (۱) اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے' یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رومس اور اس کا بھائی دونوں ستارۂ مریخ کی اولاد تھے۔ (۲) ولادتِ مسیحؑ کے پہلے سے سلاطینِ

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' طبع یازدہم' مضمون یونان۔

(۲) تاریخ روما ص ۳ دارالترجمہ حیدرآباد دکن۔

روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھتے جاتے تھے' اور ان کی پرستش کی جاتی تھی'(۱) یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پا کر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے' اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں' ان ہی سب کے پیشِ نظر اربابِ تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں' مثلاً اوتاری' شخصی' زعیمی' امرائی' دستوری' جمہوری۔

(۱) اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے' یعنی وہ حکومت جس میں صاحبِ حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور عقیدت سے اس کو مانتی ہو۔

(۲) شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت واثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو' دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گزرے ہیں۔

(۳) اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے جیسی کبھی یونان میں تھی۔

(۴) اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضعِ قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے' جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۵) زعیمی (آمرانہ) وہ طرزِ حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کے حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے' مثلاً جرمنی میں ہٹلر' اٹلی میں مسولینی' گو وہ بادشاہ نہیں تھے' مگر ان کا حکم بادشاہ کے طور پر مانا جاتا تھا' فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

(۶) اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیے کسی مدتِ معینہ کے لیے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں' جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے' اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے۔ فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے' جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے' انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیرِ اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے' خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں' اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف

(۱) ایضاً ص ۴۲۹۔

انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرزِ حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے' سیاسیینِ یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا' پرانے علما جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں' نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا' پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا' پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی' اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس میں بیک وقت مذہبی' شخصی' دستوری' جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہرے نظر آتے ہیں' اس لیے اہلِ نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے' نہ شخصی ہے' نہ دستوری ہے' نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی' کبھی شخصی' کبھی زعیمی' کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھیے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجیے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے' نہ خدا کا اوتار ہے' نہ خدا کا مظہر ہے' نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے' نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا ہے' نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے' نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے' بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں' اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے' اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے

اوراس کوحکومت کے حقوق اورفوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا' لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اوراس خیال سے کہ خلیفہ کے احکامِ شرعی کی اطاعت امت پرواجب ہے اوروہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں' اس کوشخصی کہہ دینا ممکن ہے اوراس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اورصواب دید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے اس کوزعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے' لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہلِ سیاست کے بنائے ہوئے نظریات میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کررہ گئی اوراسلام کی نظراس کے اندر کی حقیقت پر ہے' اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ' اربابِ شوریٰ کی ترتیب اورتعیین' ان کے فرائض وحقوق' ان کے انتخاب' اظہار رائے کے طریقے اوردیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں' اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اوران کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس اوراس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں' بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اوراسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اورخدا کے بنائے ہوئے اورتعلیم کئے ہوئے احکام وفرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے' اورسب ہی ایک جیسے اس کے بندے اورتابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین وحکام اورسلطنت کے عمال کے قول وفعل کوقانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق وعدل کے خلاف نہ کرسکیں' لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اورعاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اورآخرت کے مؤاخذہ کے خوف اوراللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اورعدل کے خلاف نہ کرسکیں' عام حکومتیں ہرروز اپنے ہر قانون کی لاچاری اوربے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں' پھر تیسرا اور چوتھا قانون' پھراسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی ہیں' اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگراصولِ اسلام کے مطابق ہوتو صرف خدا کا تقویٰ اورآخرت کے مؤاخذہ کا ڈران کے دل کی کجی اورعمل کی ہر برائی کوقطعاً ختم کردیتا ہے۔ جس کی بے شمار مثالیں عہدِ نبوت' زمانۂ خلافت اوربعض نیک وعادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں' لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اورعملِ صالح کی دعوت وتبلیغ برابر جاری رہے' اورمسلسل تعلیم وتربیت اورتبلیغ ودعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم وباقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اورکلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم وتربیت اورتبلیغ ودعوت دی جارہی ہے اوراسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم وتربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے' اسی طرح اس اسلامی نظامِ حکومت کی برقراری کے لیے بھی سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم وتربیت کے اجرا کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۴۰)

''حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔''

آیتِ بالا میں ارشادِ خداوندی ہے، کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے۔ دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے نمرود وفرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام وفرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی۔ زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امرِ تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک میں کئی آیتیں ہیں:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۴۰)

''حکم نہیں، مگر اللہ کا۔''

﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ﴾ (انعام:۶۲)

''ہاں! اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور وہ حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔''

﴿لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (قصص:۷۰)

''اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

امرِ تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے' وہ زمین' آسمان اور خاک وباد وآب وآتش اور جسم وجان میں ایک ذرہ کی کمی وبیشی بھی نہیں کرسکتا' نہ اشیا کے خواص کو بدل سکتا ہے' نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے' اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی واضافہ کرسکتا ہے' خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپؑ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کردیا' فرمایا:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ﴾ (بقرہ: ۵۸)

''تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال' تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔''

حکومت وسلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

﴿اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ﴾ (آل عمران:۲۶)

''اے اللہ سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے۔''

اس لیے راہِ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیے ہیں ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کرسکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع وضرر پر مشتمل ہوں۔ بے شبہ اہل عقل اپنی عقل وفہم سے فیصلہ کرسکتے ہیں' لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے' بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے' یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مرتب ہوتا ہے' اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول اللہ ﷺ کے بیان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے' اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکمِ الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امرِ غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حکم اور امر ونہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے' عام طور سے فقہا نے اس پر

ان دو آیتوں میں سے استدلال کیا ہے:

(۱)﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (انعام:۵۷، یوسف:۴۰)

''حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔''

(۲) ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (اعراف:۷)

''ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔''

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امرِ تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے۔

﴿مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ﴾ (انعام:۵۷)

''جس چیز کا تم تقاضا کر رہے، وہ میرے پاس نہیں ہے حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے، اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔''

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب حضرت یعقوب اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے:

﴿وَ مَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (یوسف:۶۷)

''اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِی اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (اعراف:۵۴)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے

پروردگار ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق وتکوین سے ہے' ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ ﴿اَمْرُ﴾ اور ﴿ حُکْمُ ﴾ کی لغوی وسعت کی بنا پر امورِ تشریعی بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں' لیکن قرآنِ پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کے مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

﴿لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ﴾ (مریم:۴۴)

"شیطان کی عبادت نہ کر۔"

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ (یٰسٓ:۶۰)

"یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کر۔"

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیا اور آئمۂ زمانہ اور خلفا کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے' جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے' لیکن دوسروں کی اطاعت' احکامِ الٰہی کی تبلیغ' اجراء اور تنفیذ کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت ہے' ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔"

اولوالامر کی اطاعت خواہ اس سے مراد علما ہوں یا حکام' خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجرا میں ہے' اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے' جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (نساء:۸۰)

"اور جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (نساء:۶۴)

"اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔"

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکمِ خدا سے ماخوذ ومستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں

ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے' ارشاد ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ﴾ (توبہ:۲۹)

''اہلِ کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اور اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دینِ حق کی اطاعت کرتے ہیں۔''

ان آیات میں اہلِ کتاب پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے' وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکمِ الٰہی کے پابند نہیں ہیں' بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (توبہ:۳۱)

''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے' اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبودِ برحق کی عبادت کریں۔''

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے' اسلام نے اہلِ کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۶۴)

''اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔''

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے۔ ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے' آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکورہ پڑھی تو عدی نے کہا ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے' فرمایا کیوں نہیں' انہوں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا' یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے' الفاظ یہ ہیں ﴿فذلک عبادتهم ایاهم﴾ ترمذی کی روایت میں ہے [1] کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے' لیکن جب وہ کسی چیز کو

(۱) تفسیر ابن کثیر۔

حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے' یہی تو شرک ہے۔ (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں' بلکہ خدا کا ہے اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے' اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے' اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطتِ حکمِ خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے' یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریقِ اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا﴾ (نساء:۶۰)

''کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا' ایمان لا چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔''

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے' ﴿کل معبود من دون اللّٰہ﴾ اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں' جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے' اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے' وہ طاغوت ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکمِ باطل اور معبودِ باطل لیا گیا ہے۔

قوانینِ الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (مائدہ:۴۷)

''اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے' حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے' اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں' اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ بقرہ اور نساء اور طلاق میں

(۱) ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

احکامِ الٰہی کے بعد ارشاد ہے:۔

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ﴾ (طلاق:۱)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔''

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ﴾ (طلاق:۱)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔''

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ○ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْہَا وَّ لَہٗ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ○﴾ (نساء:۱۳۔۱۴)

''یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے' اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلاسندِ الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام ''افتراء علی اللہ'' خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے' ارشاد ہوا:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ ہٰذَا حَلٰلٌ وَّ ہٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ○ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○﴾ (نحل:۱۱۶۔۱۱۷)

''اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال وحرام) بتاتے ہو' ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام' تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمتِ لگاؤ' یہ (دنیا میں) چندروزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے' گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر

وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کا ہر حکم' حکمِ الٰہی ہے' لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ﴾ (تحریم:۱۰)

''اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپؐ کو منع فرما دیا' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو امت کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رکھتا ہے' اس قاعدہ کی بنا پر آپؐ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی' دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے' جو صحیح نہ ہوتا' اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلّغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے' قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (توبہ:۲۹)

''اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔''

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلّغ تھے' رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے' جس طرح احکام میں اولو الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے' اصول کا مسئلہ بن گیا ہے چنانچہ علمِ عقائد اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علمِ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیرِ بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اِعْلَمْ اَنَّهٗ لَاحَاکِمَ سِوَی اللّٰهِ تَعَالٰی وَ لَا حُکْمَ اِلَّا مَا حَکَمَ بِهٖ' وَ یَتَفَرَّعُ عَلَیْهِ اِنَّ الْعَقْلَ لَا یَحْسِنُ وَ لَا یَقْبَحُ وَ لَا یُوْجَبُ شُکْرُ الْمُنْعَمِ وَ اَنَّهٗ لَا حُکْمَ قَبْلَ وَرُوْدِ الشَّرْعِ۔ (۱۱۳' ج ۱' مصر)

''جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے'

اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا' اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔''

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے' اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے۔ اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض' واجب' سنت' مستحب یا حرام' ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جا سکے نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبارِ ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے' علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

اَلْحَاکِمُ لَا خِلَافَ فِیْ اَنَّهٗ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ۔ (ص:۸۹۔۲)

''اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔''

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسلوی واضح کرتے ہیں:

''حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے' اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی' جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے' ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے' اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے' شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔'' (ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے' یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت قیاس و تجربہ کی بنا پر اہلِ عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے' مولانا محبّ اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

''حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جا سکتا ہے' یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے' اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل

سے معلوم ہوسکتا ہے' لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے' وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہوسکتا۔'' (المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہلِ اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں مولانا بحرالعلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے' فرماتے ہیں:

'' اس مسئلہ پر کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون (حاکم) عقل ہے' یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہوسکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو' بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔''

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

''اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے۔ اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو' یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلّف نہیں ہے نہ کفر حرام ہے' نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔'' (ص ۱۶' ارشاد الفحول مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں' اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے' اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے' عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر' اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (بُرا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف' امر و نہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا اس کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے' عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے' تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں' لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرعِ

الٰہی پر مبنی ہیں۔'' (اصول فقہ ص:۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصولِ فقہ کی تہذیب ہے۔ (۱) اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے' اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں' ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے وہی ایک حاکمِ آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقتِ خاص میں نازل ہوا' وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول' اور کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات' دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں' ہمیشہ یکساں رہتے ہیں' ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا' تغیر و تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا' یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں' جیسے فنِ طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں' اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں' قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے' مثال کے لیے یوں سمجھئے کہ قتلِ ناحق کی سزا قصاص' دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے' اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے' تپنچہ سے' ریوالور سے' توپ سے' گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائعِ قتل کا تغیر نفسِ مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا' کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے' پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی' اور اب طرح طرح کی گاڑیوں' سائیکلوں سکوٹروں' موٹروں' ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے' ان سے حادثے پیش آ جائیں' یا نقصان پہنچ جائے تو اصولِ کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آ سکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں' کیا وہ نیا حکم نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر

(۱) تہذیب منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے:

پوری نظر رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصولِ کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے مطابق کہ قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصولِ کلی کے ماتحت ہے انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔